Article

Analytical Study of "Shehr Khali koocha Khali"by Mustansar Husain Tarar

ناول شہر خالی، کوچہ خالی از مستنصر حسین تارڑ کا تجزیاتی مطالعہ

Shama Perveen*[1]
M.phil Scholar , Department of Urdu, GCU Faisalabad.

1. شمع پروین
ایم فل سکالر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

Correspondanance: sp052203@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 05-07-2024
Accepted:18-09-2024
Online:26-09-2024

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Mustansar Hussain Tarar is one of the important and influential travelogue writers of Urdu literature. He has written many travelogues as well as novels, including "Bahau", "Rakh", "Pyaar Ka Pehla Shahr" and Khas –O- Khashak Zamany. One of these novels is "Shahr Khali, Kucha Khali". This novel focuses on the events that happened to a single person during the Corona epidemic. The events in the novel are described in such a way that the flavor of feelings, sometimes connects them with historical events, sometimes with foreign literature and sometimes with indigenous literature. Thoughts and ideas that usually don't even come close to us in the race of life. But with isolation came the acute realization that the newly formed societies were originally habitats for different animals. Like the habitat of the deer with which the author has a dialogue. The above mentioned novel opens up new doors of feelings along with satire on social attitudes. This article presents an analysis of this novel.

KEYWORDS: Literarture, History, Modernism, Narrative Techniques, Urdu Novel, Corona Epidemic.

تاریخ گواہ ہے کہ المیہ بہترین ادب کو جنم دیتا ہے۔ یہ المیہ جنگوں کی وجہ سے پیدا ہوا ہو یا فسادات کی وجہ سے۔ یہ قحط ہو یا کوئی وبائی مرض المیہ ہمیشہ انسانی جذبات احساسات، خیالات، حالات وواقعات اور انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اُس کی عکاسی افراتفری، بے چینی، بے بسی، اضطراب، ڈر، خوف، اپنوں سے بچھڑنے کی اذیت، انہونی کا خوف، اور بے چارگی جیسے جذبات سے ہوتی ہے۔ المیہ کبھی بھی خوش کن احساسات کو جنم نہیں دیتا۔ دُنیا میں مختلف ادوار میں وبائیں پھوٹتیں رہی ہیں۔ جو انسانی جانوں کے ساتھ ساتھ معشیت کی بربادی کی بھی ذمہ دار ٹھہرتی ہیں۔ ادب و تاریخ کے اوراق ہمیں اُس وبائی دور میں ہونے والے اثرات سے آگہی فراہم کرتے ہیں۔ اس دوران تخلیق ہونے والا ادب شہر آشوب کے زمرے میں آتا ہے۔ شہر آشوب کی بجائے اسے زمینی آشوب یا ساری انسانیت کا مرثیہ، نوحہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ برطانوی مصنف ڈینیل ڈیفو نے "اے جنرل آف پلیگ ائیر" جو کہ طاعون کے متعلق ہے۔ جو وباء کی صورت اختیار کر گیا تھا۔

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ وباء بہت زیادہ پھیلی۔ اس وقت کی صورت حال کو مختلف مصنفین نے اپنے اپنے اندازِ تحریر سے قلمبند کیا۔ جن میں سے البرٹ کامیو کا ناول "دی پلیگ" نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ گیبریل مارکیز کا ناول "love in time of cholera" جس کا اردو ترجمہ "وباء کے دنوں میں محبت" کے نام سے کیا گیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول "one hundred years of solitude' کا اردو ترجمہ "تنہائی کے سو سال" کے عنوان سے کیا گیا ہے۔ یہ ناول وبائی ادب میں شامل ہوتے ہیں۔

اردو ادب میں ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "توبتہ النصوح" جس کا آغاز ہی وباہ کے ذکر سے ہوتا ہے۔ جیسے:

"ایک مرتبہ دلی میں ہیضہ پھیلا" (۱)

راجندر سنگھ بیدی نے افسانوں میں وباء کو اپنا موضوع بنایا اسی طرح شعراء کرام بھی خود کو وباء 'قحط، اور کے حالات کو قلم بند کرنے سے روک نہ سکے۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو (۲)

جگر مراد آبادی نے قحط کو کچھ اس طرح سے شعری جامہ پنہایا ہے۔

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ
بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں (۳)

ہندی کے مشہور صحافی پریہ درشن سہمے ہوے دل کی گہرائی کو کریدتے ہیں۔

کچھ دکھ ڈر سے بھی پیدا ہوتے ہیں
جیسے کچھ ڈر دُکھ سے پیدا ہوتے ہیں
لیکن ڈر ہو یا دُکھ
دونوں اکیلا کر دیتے ہیں
یہ اکیلا پن
اب جیون ہوتا جا رہا ہے(۴)

کورونا وباء کی آمد نے جہاں ایک طرف عالمی معیشت، ٹیکنالوجی، سیاست اور تعلیمی نظام کو متاثر کیا۔ تو دوسری طرف اس چھوٹے سے جراثم نے انسانی مزاج اور زبان وادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اہلِ قلم نے کورونا وائرس کے دوران اپنی شب وروز کی مصروفیات، خیالات و احساسات کو صفحہ قرطاس پر اتارا۔ اس میں ناصر عباس نیر کا افسانہ "مرگ عام نعمت ہے" اور افضل مراد کے افسانے "آخری آدمی" اور "نوٹوں کہ گنتی" منظرِ عام پر آئے۔ معروف ادیب حسن منظر نے بھی "وباء" کے نام سے ناول لکھا۔

مستنصر حسین تارڑ دُنیائے ادب میں اپنی انفرادیت کی وجہ سے اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف۔اے کرنے کے بعد انگلینڈ سے چند ٹیکسٹائل کورسز کیے۔ انگلستان میں قیام کے دوران تھیٹر، فلم اور موسیقی کو اپنی تمام تر دل چسپیوں کا مرکز بنایا۔ وکٹر سلوٹر سکول آف ڈانسنگ انگلینڈ سے وانر، رمبا اور مشکل ترین رقص ٹینکو میں مہارت کا سرٹیفیکیٹ حاصل کیا۔ سفر کرنے اور نت نئی جگہوں پر جانے کے شوقین تھے۔ شوقِ آوارگی جہاں جہاں بھی لے گیا، سفر کرتے رہے۔ مجید نظامی کے کہنے پر سفر کے دوران پیش آنے والے تمام واقعات قلمبند کیے۔

روسی ناول نگاروں کو اپنا ادبی مرشد مانتے ہیں۔ یشار کمال، ترکی سے، فلسطین سے محمود درویش، مصر سے نجیب محفوظ، فرانس سے سارتر کو پسند کرتے ہیں۔ کافکا اور کامیو کی تحریروں کو بھی سراہتے ہیں۔ مذہبی سکالر پروفیسر رفیق اختر سے انسیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عبد القدیر خان، ڈاکٹر عبد السلام، ایم ایم عالم کو اپنا قومی ہیرو مانتے ہیں۔ ایدھی صاحب کے تو پرستار ہیں۔ پاکستان ٹیلی ویژن پر طویل عرصہ کام کیا۔ آپ کو اب تک متعدد ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے۔

نانک یونیورسٹی میں ان کا ناول "پکھیرو" شاملِ نصاب ہے۔ روس میں پاکستان کو فیض احمد فیض کی شاعری اور مستنصر حسین تارڑ کی نثر کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے۔ چند اہل قلم کے خیال میں مستنصر نئی نسل کے چیخوف ہیں۔ کورونا وباء کے دوران جہاں تمام شعبہ ہائے زندگی کی سرگرمیاں معطل ہو گئیں وہاں تخلیقی ذہین بیدار رہے اور وباء کے تناظر میں اپنے خیالات واحساسات کو بیان کرتے رہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس ناول کا عنوان افغان شاعر اور موسیقار امیر جان صبوری کے کلام کے پہلے مصرعے سے لیا گیا ہے۔

شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ خالی، خانہ حال
جام خالی، سُفرہ خالی، ساغر و پیمانہ
خالی کوچ کردہ، دستہ دستہ، آشنایان، عندلیبان
باغ خالی، باغیچہ خالی، شاخہ خالی، لانہ خالی(۵)

گلوکارہ نگار خالدہ نے اسے گایا ہے۔اس ناول میں انٹون چیخوف کی نظم "وباء کی تنہائی" صفحہ نمبر سات پر آتی ہے۔ناول کا باقاعدہ آغاز فاختہ اُڑان میں ہے سے ہوتا ہے۔سوچتی ہے کیا سورج کی موت واقع ہو چکی ہے۔اگر وہ مر چکا ہے تو کیا تدفین کے موقع پر چاند ستارے آئے تھے۔اُس کے جنازے کو کندھا دینے والوں میں کون کون شامل تھا۔فاختہ اپنے سفر پر گامزن، سوچتی ہے۔

"نہیں سورج کو دفن کرنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ہر ایک کو خدشہ ہو گا، اُسکا بدن چاہے کتنا سرد اور زرد ہو چکا ہو گا پھر بھی اُس میں کچھ نہ کچھ حدت تو باقی ہو گی جو غسل دیتے وقت بھاپ کی صورت اختیار کرتی ہو گی پر اُسے غسل بھی نہیں دیا گیا ہو گا۔"(۶)

اس میں کورونا وباء کے دوران تدفین کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جراثیموں سے ڈرتے ہوے نہ کوئی جنازہ گاہ کی طرف آتا اور نہ کوئی ہاتھ تدفین کے لیے آگے بڑھتا ہے۔فاختہ کو کشتی والے نے ایک اہم ذمہ داری سونپی ہے جس کی تکمیل کے لیے اُسے کشتی والے نے طور کی تپش کی چنگاریاں، آتشِ نمرود کے شرارے، مصلوب کی آخری سانسوں کی گرمی، غارِ حرا میں سلگ چکے کسی پتھر کی سلگاہٹ دے کر بھیجا تھا۔جس کی حدت آئندہ کے زمانوں پر بھی محیط تھی۔اِسی وجہ سے اُس کے اندر زیادہ ہمت سے ذمہ داری کو خوش اُسلوبی سے انجام دینے کی خواہش تھی۔

"اُسے تب تک اپنی اڑان جاری رکھنا تھی جب تک ایک وباء کی مانند پھیلے پانیوں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا دکھائی نہ دے جائے، اور وہ دکھائی نہ دیتا تھا۔۔جُوں جُوں اُس کے بدن سے وہ حدت رخصت ہوتی تھی وہ محسوس کرتی تھی کہ تھکاوٹ کی چمگادڑیں اس کے پروں تلے اپنے گھونسلے بنانے لگی ہیں۔(۷)

اس تھکاوٹ کے باوجود اُسے اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زندگی میں تگ و دو کے لئے کوئی قید نہیں۔بعض اوقات فاختہ کو شاہین کی طرح پرواز کرنی پڑتی ہے۔سب کو نظر انداز کر کے اپنے مقصد کے لیے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔دورانِ سفر نابینا چراغ کی اندھی لو سے واسطہ پڑتا ہے۔لیکن سراب اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔فاختہ خود کلامی کرتی، خود کو مشورہ دیتی اپنے مقصد کے حصول کے لیے گامزن، تھکاوٹ سے بے حال ہے۔

"اپنے پروں کا بھنور میں ڈوبنے کا منظر دیکھ کر فاختہ کے مٹھی بھر دل میں تھرتھراہٹ سی خوف کی ہوئی کہ اگر اڑان کی یہ تھکاوٹیں اور پرواز کی لاحاصلگی اس کے حواس پر اثر انداز ہوتی چلی گئی۔ وہ یونہی پانیوں پر جلتے سراب چراغوں کی جانب لپکتی چلی گئی تو پھر اس کی حیات کا کچھ بھروسہ نہیں۔ یہ بہتر نہیں کہ میں پلٹ جاؤں۔۔۔وبا کے پانیوں کی چادر کرۂ ارض کے کونوں تک ہموار بچھی ہوئی تھی.. لیکن اس کی ہموارگی پر کشتی کا کوئی نشان نہ تھا.. کشتی وہاں موجود نہ تھی.."(۸)

اس کے بعد مصنف آپ بیتی کی صورت میں ناول کا آغاز کرتا ہے۔ کورونا کے دوران اس نے اپنے احساسات و جذبات اور رونما ہونے والے واقعات کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ دل چسپی کے ساتھ ساتھ کورونا وباء کے دوران قید ہونے والوں میں بزرگ قیدیوں کے ساتھ خصوصی انسیت محسوس ہوتی ہے۔ مصنف کو وباء سے کچھ افاقہ بھی ہوا ہے اسے ٹھیک سنائی دینا شروع ہو گیا ہے۔ جہازوں کا شور جو اس کے گھر کے اوپر سے گزرتے تھے اب وہ وباء کی وجہ سے حنوط ہو چکے ہیں۔ مصنف شور کی آلودگی سے پاک ماحول میں آ گیا ہے۔

ناول نگار کو "کامیو" بہت پسند ہے اس لیے ان کے ناول "دی پیلگ" کا ذکر کیا۔ البرٹ کامیو کا یہ ناول ۱۹۴۷ میں شائع ہوا۔ یہ طاعون کے وبائی اور اس وقت پیش آنے والے حالات تو واقعات کے متعلق ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اس وقت ہم اسی صورتحال سے دوچار ہیں۔ لیکن انداز بیان مختلف اور دل نشین ہے۔ اس ناول سے بیماروں کی قطاروں ان کے تیارداروں کا ہجوم اور ڈاکٹروں کی بھاگ دوڑ نظر نہیں آتی ہے۔ بلکہ ناول نگار نے اس کو اپنی پسند کے پرندوں، جانوروں، خوبصورت پھولوں، ہمت والے جملوں اور امید افزا مناظر سے مزین کیا ہے۔ مصنف اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھتا ہے کہ:

"پرندے واپس آ گئے تھے۔ انسانی آبادیوں نے انہیں جیسے ہجرت کو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کے شجر سر کنڈے اور جنگل چھین کر انہیں بے گھر کر دیا تھا۔"(۹)

وباء کے دوران سماجی فاصلے کی بنا پر مصنف گھر میں سب کے ہونے کے باوجود اکیلا ہے۔ اخبار بھی سینی ٹائزر سپرے کے بعد موصول ہوتا تھا۔ سیر کے لیے جانے پر پابندی، بچوں کے گلے ملنے پر پابندی ان پابندیوں نے مصنف کو ایک دوسری دنیا کا باسی بنا دیا۔ جس میں پرندوں، جانوروں، خوشگوار سوچوں، کتابوں اور ادیبوں کی محفل عروج پر ہے۔ وباء کے دوران ساری دنیا میں ایک ہی موضوع گفتگو کے لیے اور ایک ہی طرح کے انداز سے زندگی نے ایکسانیت پیدا کر دی ہے۔

"زندگی ایک مخصوص ٹھہراؤ کا شکار ہو گئی ہے۔ سب انسان صرف ایک ہی موضوع پر اٹکے ہوئے ہیں۔ روزانہ کے معمول سب کے ایک جیسے ہیں۔ جیسے انہیں زندگی بسر کرنے کا ہدایت نامہ فوٹو سٹیٹ کروا کے دے دیا گیا ہے۔ ہم اپنے اس روبوٹ کردار سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ اس صورت حال میں ٹیلی ویژن کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا پڑتا ہے۔"(۱۰)

مصنف ٹیلی ویژن کے پروگراموں پر گہرے طنز کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"میرے پسندیدہ چینل وہ ہیں جن پر چوبیس گھنٹے کارٹون چلتے رہتے ہیں اور ان کو میں از حد دلچسپی سے دیکھتا ہوں۔ کہ کارٹون کرداروں نے نہ تو ہاتھوں میں دستانے پہنے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان پتلیاں ہونے یا جادوگر ہو جانے کا کچھ امکان ہوتا ہے۔ دراصل یہ کارٹون کردار ہی ہمارے معاشرے کے آخری ایماندار اور باضمیر لوگ ہیں۔۔"(۱۱)

ناول پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف اور قاری آپس میں گفتگو کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ مصنف کے کمرے کے سامنے جو لان ہے اس کی منڈیر پر مختلف پرندے آ کر بیٹھتے ہیں جن سے اس کی دوستی ہے۔ مصنف لکھتا ہے:

"یہ منڈیر میرے اکلاپے کی واحد تفریح ہے اور میں اسے دیکھتا رہتا ہوں... جس روز وہاں پرندوں کی مختلف نسلوں کا ہجوم اتر آئے تو میرا دل ایک سفید کنول کی مانند کھل جاتا ہے۔"(۱۲)

اصل میں یہ ناول ایسے بوڑھے کی آپ بیتی ہے جسے موت کا خوف ہے۔ وہ وبائی مرض سے مرنا بھی نہیں چاہتا اور بچاؤ کی تدبیروں سے بھی عاجز ہے۔

"کبھی کبھی مجھے خشک کھانسی کا دورہ پڑتا ہے اور بخار بھی محسوس ہوتا ہے... کہیں یہ شکار ہو جانے کی ابتدائی علامتیں نہ ہوں..."(۱۳)

ناول نگار کی معاشرے میں ہونے والی ہر تبدیلی پر گہری نظر ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے ویران جگہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جانوروں کی رہائش گاہوں کو نئی سوسائیٹیز (Societies) کا نام دے کر جانوروں کو اپنی فطری رہائش گاہوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ انسان تو بھول گیا کہ پہلے اس جگہ کون آباد تھا لیکن بے دخل ہونے والوں کو یاد ہے۔ ان میں سے ایک ہرن مصنف سے اپنی رہائش کا تقاضا کرتا ہے لیکن مصنف نے وہ زمین پیسوں کے عوض خریدی ہے۔ ہرن بضد ہے کہ یہ ہماری رہائش گاہیں تھیں جن پر تم انسانوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اگر نفسیات کی زبان میں کہا جائے تو یہ التباس (Illusion) ہے۔

"آج تمہارے شہر ویرانے ہو گئے ہیں۔ بستیاں سنسان ہو گئی ہیں اور تم لوگ خوفزدہ چوہوں کی مانند اپنے اپنے گھروں کے پنجروں میں بند ہو چکے ہو۔

اپنے اوپر نازل ہونے والی وبا کے جواز کبھی سائنس کی کتابوں میں تلاش
کرتے ہو اور کبھی مقدس صحیفوں کا سہارا لیتے ہو۔ اور جانتے ہی نہیں کہ تم
نے جو ظلم کمایا ہے یہ اس کا نتیجہ ہے۔"(۱۴)

مصنف ایک پختہ قلم کار ہے۔ منظر نگاری اور تصویر کشی میں ملکہ حاصل ہے۔ جب چاہتا ہے وبا سے ان میں ہونے والے تکلیف دہ واقعات سے ہمیں دل گرفتہ کر دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے اس دل گرفتگی میں سامان تسلی و تشفی فراہم کر دیتا ہے۔ اجتماعی قبروں پر ایک شگفتہ سا طنز کرتے ہیں:

"اجتماعی قبر میں پرائیویسی تو بالکل نہیں ہوتی..."(۱۵)

اس ناول میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگلی بات کا آغاز کرنے سے پہلے ایک دو سطریں الگ صفحہ پر بیان کی جاتی ہیں۔ اور باقی صفحات پر یوں سمجھیں ان کی تشریح۔ شاہ حسین، بُلھے شاہ، مستنصر حسین تارڑ کے پسندیدہ صوفی شاعر ہیں۔ ان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان مجذوبوں کا بھی کچھ دین ایمان نہیں۔۔۔ شاہ حسین اپنی موت سے
پہلے مر جانے کا تمنائی ہے اور بلھے شاہ کہتا ہے کہ اَساں مرنا ہیں گور پیا کوئی
ہور..."(۱۶)

اندر کے سفر اور موت سے مراد تصوّف کی طرف اشارہ ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ تنہائی میں پیغمبری نازل ہوتی ہے۔ موت کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انسان دنیا کی ہر حقیقت کو تسلیم کر لیتا ہے۔ لیکن موت کی حقیقت کو کبھی
نہیں، کم از کم اپنی موت کی حقیقت کو کبھی نہیں... شاید موت سے انکار ہی
زندگی کی علامت ہے..."(۱۷)

آگے چل کر فاختہ سے زندگی کی امید رکھتے ہوئے اسے کشتی والے کے اِذن کی یاد دہانی کے بعد فاختہ کا عہد کچھ اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

"میری یہ اڑان اب تبھی اختتام کو پہنچے گی جب وبا کے پانیوں میں سے ابھرتا
خشکی کا کوئی ٹکڑا مجھے دکھائی دے گا اور میں لپک کر اس کی جانب گرتی چلی
جاؤں گی... میں کسی نہ کسی منڈیر پر اتروں گی... یہ میرا وعدہ ہے..."(۱۸)

لکھاری نے نثر کے ساتھ ساتھ نہایت خوبصورتی کے ساتھ نظم / شاعری کی زبان میں بھی اس وبا کے پیدا ہونے اور اس کے اثرات کا اظہار کیا ہے۔ اس طویل نظم سے چند اشعار ہیں:

"پرندہ پَر جھاڑ رہا ہے..
جھاڑ نہیں رہا جھڑ رہے ہیں..

جھڑ نہیں رہے، نوچے جا رہے ہیں..
اور اُس کے پَر کون نوچ رہا ہے..
وہ جو سب سے بڑا پرندہ ہے..
اس پرندے کا خالق پرندہ ہے.."(۱۹)

اس پرندے کی تمام تر خوبیوں خامیوں اور متکبرانہ انداز جنگجوانہ طریقے نے اسے کس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اب اس کے پر واپس بڑا خالق پرندہ کرتا ہے یا نہیں۔

"ابھی فیصلہ نہیں ہوا کہ کیا اسی لوتھڑے کو..
نئے بال و پر بخش دیے جائیں اور..
اسے پھر سے دنیا کی حاکمیت سپرد کر دی جائے..
یا ایک نئے ادم کو اتارا جائے.."(۲۰)

اس آدم کی لامتناہی خطاؤں اور اُن خطاؤں پر شرمندگی محسوس نہ کرنے کی وجہ سے شاعر اس سوچ میں ہے کہ شاید کوئی نیا آدم اتارا جائے۔ یہ نئی زندگی کسی نئے طریقے طرزِ حیات کی خواہش بھی ہو سکتی ہے۔ مصنف نے تمام واقعات، خیالات اور موجودہ حالات کو بیان کرتے ہوئے تسلسل اور روانی کو اپنے قلم کا خصوصی جزو بنایا ہے۔ ناول میں ہمیں مولوی حضرات کے طور طریقوں پر طنز بھی ملتا ہے۔ جیسے:

"کورونا پر جو تحقیق جاری ہے اگر اس نتیجے پر پہنچے کہ الکوحل کورونا کو دور رکھنے کے لیے معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ تو کچھ بعید نہیں کہ باقاعدگی سے نہ سہی کبھی کبھار یہ حضرات گھونٹ دو گھونٹ پی ہی لیں، یا جس قدر ملے اور صبح کو توبہ کر لیں"(۲۱)

کورونا وبا کے سلسلے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے مصنف مختلف فلموں کا تذکرہ کرتا ہے جیسے "برڈ مین آف ال کٹراز" H.G.Wills کے ناول پر مبنی فلم War of the World اسی نوعیت کی ایک اور فلم End of the world ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ سکرین کی تمام تر شعبدہ بازیاں حقیقت کا روپ دھار کر کورونا وبا کی صورت میں ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔

اسے زندگی کی رمق یوگا اور ہمینگو کی سنوز آف کلی منجاروز میں نظر آتی ہے۔ جو اس انتظار (گریگوری پیک) میں ہے کہ پنکھوں والا جہاز آئے گا اور اس تہذیب کی طرف لے جائے گا جس سے وہ صحت مند ہو جائے گا۔ مصنف قید تنہائی سے نکل کر داتا صاحب جاتا ہے وہاں کبوتروں کو دانہ پانی ڈالنے کا اہتمام کرتا ہے۔ لیکن واپسی پر اسے کورونا لاحق ہو جاتا ہے۔ جس سے اہل خانہ ہراساں ہوتے ہیں ڈاکٹر حضرات علاج معالج میں سست روی کا صرف اس لیے شکار ہیں کہ اس

بوڑھے کی جگہ کسی جوان کو وینٹیلیٹر دے دیا جائے۔ مریض خوش نصیب اور پُر امید ہے کہ نہ صرف اس کا علاج بہتر طریقے سے ہو گا بلکہ وہ تندرست بھی ہو جائے گا کیونکہ:

> "میری کانچ ایسی شفاف ہو چکی آنکھوں میں بینائی کے ان گنت چراغ جل اٹھے.. ہر چراغ کی لو میں ایک فاختہ تھی جو دور دیسوں سے آئی تھی اور روشنائی کی اس دمک میں میں نے دیکھا کہ فاختہ کی چونچ میں خشکی کی ایک نشانی ہے.. کیکڑ کے زرد پھولوں کی ایک بڑی ہے، دھریک کے کاسنی پھولوں کا ایک گچھا ہے.. یا شاید زیتون کی ایک شاخ ہے۔ پانی سمٹ جائیں گے.. کشتی کنارے پر لگ جائے گی.. فاختہ منڈیر پر بیٹھی تھی اور اُس کی چونچ میں خشکی کی ایک نشانی تھی.. فاختہ منڈیر پر بیٹھی مجھے دیکھے جا رہی تھی.. اور میں فاختہ کو تکتا جاتا تھا.."(۲۲)

یہ سارا ناول کورونا وباء کے دوران فردِ واحد کے ساتھ ہونے والے واقعات ہیں۔ جن میں احساسات کی چاشنی، انہیں کبھی تاریخی واقعات کے ساتھ جوڑتی ہے، کبھی غیر ملکی ادب اور کبھی لٹریچر کے ساتھ منسلک کرتی ہے۔ ایسی سوچیں اور خیالات جو عموماً زندگی کی دوڑ میں ہمارے قریب بھی نہیں آتے۔ لیکن تنہائی ملتے ہی شدت سے احساس ہوا کہ نئی بننے والی سوسائیٹیز اصل میں مختلف جانوروں کا مسکن ہوا کرتی تھیں۔ جیسے ہرن کا مسکن تھا جس کے ساتھ مصنف کا مکالمہ بھی ہوتا ہے۔ معاشرتی رویوں پر طنز کی چوٹ کے ساتھ احساسات کا نیا در کھولتا ناول ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نذیر احمد، ڈاکٹر، توبتہ النصوح، الٰہ آباد: رام نرائن پبلشرز اینڈ بکس، ۱۹۳۶، ص ۳

۲۔ BBC.Urdu

۳۔ BBC.Urdu

۴۔ BBC.Urdu

۵۔ مستنصر حسین تاڑر، شہر خالی، کوچہ خالی، لاہور: سنگِ میل پبلشرز، ۲۰۲۰، ص ۵

۶۔ ایضاً، ص ۹

۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۸۔ ایضاً، ص۱۸۔۱۹

۹۔ ایضاً، ص۲۸

۱۰۔ ایضاً، ص۴۴

۱۱۔ ایضاً، ص۴۵

۱۲۔ ایضاً، ص۴۸۔۴۹

۱۳۔ ایضاً، ص۵۵

۱۴۔ ایضاً، ص۶۶

۱۵۔ ایضاً، ص۱۲۸

۱۶۔ ایضاً، ص۸۳

۱۷۔ ایضاً، ص۹۰

۱۸۔ ایضاً، ص۱۰۹

۱۹۔ ایضاً، ص۹۳

۲۰۔ ایضاً، ص۱۰۰

۲۱۔ ایضاً، ص۱۱۶

۲۲۔ ایضاً، ص۲۱۶